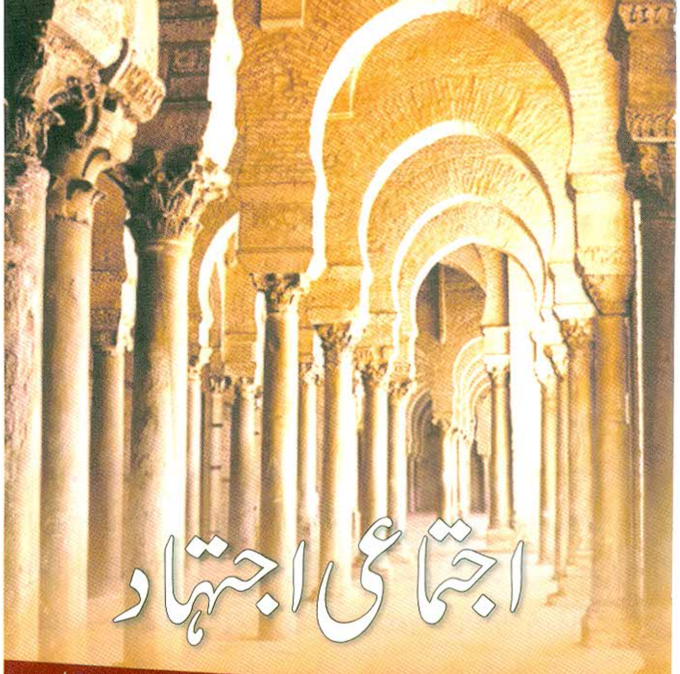

اجتماعی اجتہاد

طارق مجاہد جہلمی

انگریزی زبان میں جسے Collective Diligence یا Collective exertion in solving a question کہاجاتا ہے یہ اجماع (Consensus) سے عبارت ہے۔

انفرادی اجتہاد پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس میں لغوی اعتبار سے اجتہاد کی روایتی تعریفات میں بابِ افتعال کی صرف مبالغے کی خصوصیات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اگر بابِ تفاعل کی خصوصیات کے معنی کو ملحوظِ خاطر رکھ لیا جائے تو اس میں مشارکت کا مفہوم ابھر آتا ہے، یعنی مل جل کر کام کرنا، جس سے اجتماعی اجتہاد کا تصور سامنے آجاتا ہے اور باب میں تعامل کے معنی بن جاتے ہیں (۱)

''جب سلاطین کی نوازشات کی بدولت علماء میں شریعت کی بجائے تشرع (لفظ قانون کی پیروی) کا نقطۂ نگاہ پیدا ہوا تو احکام شریعت کی اتباع میں خلوص ناپید ہونے لگا تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے صوفیائے کرام نے تزکیہ کی خاطر طریقت پر زور دیا اور مسلم معاشرے میں شریعت وطریقت دینی زندگی کے دو مظہر بن گئے۔ جب تک سلاطین اقتدار قانون کی قوت نافذہ سے محروم نہیں ہوئے تھے تو قانون سازی کے ذریعے اقدار حیات کی حفاظت کی جاتی رہی۔ اچانک مؤثرات زندگی بدل گئے۔ جب مؤثراتِ زندگی، علم، اخلاق، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی معیارِ زندگی بدل جائیں تو جو تدبیر اقدارِ حیات کی حفاظت کے لیے تبدیلی سے پہلے وضع کی گئی تھی، اس کی خلاف ورزی کے بغیر زندگی کے تقاضے پورے ہونے بند ہوجاتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں فقہائے اسلام اجتہاد کے ذریعے طریق کار میں وہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں، جس سے انحراف کی راہ اختیار کرنے والوں کو روکا جا سکے مگر ''ہمہ اجتہاد'' اور ''فقہی اجتہاد'' میں فرق ہے۔

اگر مؤثراتِ زندگی بدل جائیں اور زندگی کے تقاضے انحراف کے بغیر پورے ہونے بند ہو جائیں، تو فقہی اجتہاد بھی بے اثر ہوجاتا ہے کیوں کہ قانون کی پیروی کی آرزو ختم ہوجاتی ہے (۲)

ظاہر ہے، ایسی صورت میں ''اجتماعی اجتہاد'' قوتِ نافذہ اور پیروری کی آرزو مہیا کرتا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت وفضیلت اور ضرورت عیاں ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ اسلام میں دینی فکر کی تشکیل نو کے چھٹے خطبے ''اسلام کی ہیئتِ اجتماعی میں حرکت کا اصول'' یعنی ترقی وزندگی کا اصول میں رقم طراز ہیں:

فقہ اسلامی کا تیسرا ماخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک یہ قانون اسلامی کے تصورات میں سب سے اہم ہے۔

موجودہ صورت حال کو سامنے رکھ کر وہ کہتے ہیں:

اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیشِ نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر وقیمت اور اس کے منفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلادِ اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو ونما اور قانون ساز مجالس کا بتدریج قیام بڑا ترقی زا قدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذاہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فرداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق ''مجالس تشریعی'' کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس لیے ممکن بھی ہے تو ''اجماع'' کی شکل میں ...... مزید برآں غیر علماء بھی جو ان امور میں گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے۔ میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے، جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے، از سرِ نو پیدا کر سکتے ہیں۔ یونہی اس کے اندر ایک ارتقائی نقطۂ نظر پیدا ہوگا۔ (۳)

آگے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

لیکن ابھی ایک اور سوال ہے، جو اس سلسلے میں کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ موجودہ دور میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی، اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے، جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں لہٰذا اس کا طریقِ کار کیا ہوگا، کیوں کہ اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں بڑی بڑی شدید غلطیاں کر سکتی ہیں لہٰذا ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہوگی؟

آگے علامہ موصوف ایرانی دستور اور اس کے خطرناک پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے سنی ممالک کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سنی ممالک اسے (مجالس تشریعی) اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر۔ انہیں چاہیئے مجالسِ قانون ساز میں علماء کو بطور ایک ''مؤثر جزو'' شامل تو کر لیں لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث وتمحیص اور اظہارِ رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔

بایں ہمہ شریعت اسلامیہ کی غلط تعبیرات کا سد باب ہوسکتا ہے، تو صرف اس طرح کہ بحالت موجودہ بلادِ اسلامیہ میں فقہ کی تعلیم جس نہج میں ہو رہی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی باحتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ (۴)

"مجالسِ تشریعی" کے توسط سے روپذیر ہونے والے اجماع کو علامہ موصوف کے نزدیک اس قدر اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس طریق سے مختلف ملکوں کے اہلِ نظر و قانون کے باہم قریب آ جانے کی امید ہوگی لہٰذا انفرادی اور مسلکی بلکہ فرقہ وارانہ اجتہاد کی بجائے، اگر مجالس تشریعی میں کسی مسئلے کی چھان پھٹک ہو جائے، تو اس میں وہ لوگ جو علماء فقہ تو نہیں، مگر زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ہونے کی بنا پر اپنے تجربات کی روشنی میں رائے دینے پر قادر ہوں گے، رائے دیں گے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا کوئی فیصلہ بھی قرآنی روح سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ مجلس تشریعی اساساً قرآنی روح کو ہی بروئے کار لائے گی، مگر مختلف زاویہ ہائے نظر اور گوناگوں تجارب کی عطا کردہ بصیرت کا ایک جگہ جمع ہو جانا فرحت بخش ہے۔(۵) چنانچہ شیخ عبدالقادر المغربی لکھتے ہیں:

اہل یورپ نے جماعت اور اجتماع سے فائدہ اٹھایا۔ اسے اپنے سماجی اور سیاسی اداروں کی اساس بنایا جب کہ مسلمان جن کے ہاں اس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، غافل رہے۔ مجلسِ اعیان، مجلسِ نواب، سناتو، رشتاغ، اسمبلی، پارلیمنٹ اور مؤتمر اسلام اس کی مثالیں ہیں۔(۶) بہر حال مذکورہ مباحث کا حاصل مطالعہ یہی نکلتا ہے کہ مفکرینِ ملتِ اسلامیہ انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اجتہاد کے قائل تھے مگر اس میں علماء کرام کی شمولیت اور سرپرستی کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں۔

عصری علماء کا اجتماعی اجتہاد

مولانا ابوالعرفان ندوی، "فکر اسلامی کی تشکیل جدید: ضرورت و اہمیت" میں لکھتے ہیں:

علم کا قافلہ بہت آگے نکل چکا ہے اور تحقیق و اکتشاف کے نئے گوشے اب سامنے آ چکے ہیں۔ ایک شخص کی مختلف علوم میں جامعیت و مہارت کا تصور بتدریج ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے یہ تو بظاہر ممکن نہیں ہے کہ دین کے عقائد و احکام کے سلسلے میں تمام باریکیوں پر نظر رکھنے والا اور جدید حالات، تقاضوں اور ضروریات پر فنی نظر رکھنے والا ایک ہی شخص ہو۔ اس لیے اس عہد میں جو اجتماعیت کا عہد ہے، ضروری ہے کہ نئے مسائل پر غور و خوض بھی اجتماعی طور پر ہو اور دونوں طرح کے اہل علم، ایمان و احتساب کے ساتھ نئے نئے مسائل کا حل تلاش کریں۔(۷)

ڈاکٹر منیر احمد مغل اپنے ایک مقالے 'شریعت کا مفہوم' میں رقم طراز ہیں:

دورِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ تمدن کی ترقی سے جو نئے مسائل امتِ مسلمہ کو درپیش ہیں، وہ انفرادی اجتہاد سے حل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے بین الاقوامی سطح پر مسلمان فقہاء و مفکرین کی ایک ایسی مجلس کی ضرورت ہے، جو پوری امتِ محمدیہ ﷺ کی نمائندہ ہو اور پورے غور و خوض اور خلوصِ نیت کے ساتھ ان مسائل کا حل پیش کرے اور اپنی اس رائے کو امت کے ردّ و قبول پر چھوڑ دے۔ ایک مدت کے گزرنے کے بعد امتِ اسلامیہ خود بخود یا تو اس کو تسلیم کرے گی یا رد کر دے گی کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق پوری امت گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اجتہاد اور اجماع فطری طور پر دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔(۸)

حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر **الاعتصام** لاہور لکھتے ہیں:

اجتماعی اجتہاد ہی کے ذریعے سے عصری مسائل کا حل تلاش کیا جانا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے فاضل علماء کی ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے، جو اپنے اسلامی کردار اور زہد و ورع میں بھی ممتاز اور اس لحاظ سے مسلم عوام میں قابل اعتبار گردانے جاتے ہیں اور وہ قرآنی علوم اور احادیث پر بھی گہری نظر کے ساتھ چاروں مذاہب فقہ کی کتابوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ وہ ہر فقہ کی دو دو اہم اور بنیادی کتابیں رکھیں، مثلاً فقہ حنفی سے **المبسوط** اور **البدائع و الصنائع**، فقہ مالکی سے **مؤطا امام مالک** اور **المدونة الکبریٰ**، فقہ شافعی سے **کتاب الام** اور **شرح مهذب** اور فقہ حنبلی سے **المغنی لابن قدامه** اور **کشاف القناع** اور فقہ ظاہری سے **المحلی لابن حزم** اور فقہ الحدیث سے **صحیح بخاری** اور دوسری کتب ستہ۔ ان کتابوں میں مزید کمی و بیشی یا رد و بدل ممکن ہے۔ یہ ایک سرسری خاکہ ہے، جس میں مزید رنگ و روغن بھرا جا سکتا ہے۔ ان تبحر علماء کی کمیٹی میں جدید علوم و فنون یعنی اقتصادیات، اجتماعیات، قانون و تجارت وغیرہ جملہ علوم عصریہ کے ایسے ماہرین شامل کیے جائیں، جو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے اور کھرے مسلمان ہوں۔ تعلیم جدید نے ان کی ایمانی بنیادوں کو متزلزل نہ کیا ہو، بلکہ وہ عصری مسائل کا ادراک و شعور رکھنے کے ساتھ ان کے شرعی حل کا احساس و جذبہ اور دلی تڑپ بھی رکھتے ہوں تا کہ علماء شریعت جدید عصری معاملات اور فنی (ٹیکنیکل) مسائل میں ان کی رائے اور تفصیلات پر اعتماد کرتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور جدید مسائل کی تہ تک پہنچنے میں علماء کو آسانی ہو۔ مذکورہ فقہی کاوشوں سے استفادہ کرتے ہوئے اور علم جدید سے بہرہ ور دیانت دار لوگوں کی رائے اور معلومات کو سامنے رکھ کر کھلے دل و دماغ سے اجتہادی مسائل کا حل اس اجتماعی طریقے سے نکالا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عصری مسائل کو شرعی احکام کے ساتھ تطبیق نہ دے سکیں اور ان کا مناسب حل تلاش نہ کر سکیں۔(۹)

> تمدن کی ترقی سے جو نئے مسائل امتِ مسلمہ کو درپیش ہیں، وہ انفرادی اجتہاد سے حل نہیں ہو سکتے۔

جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب سرپرست ادارۂ منہاج القرآن سے سوال کیا گیا کہ 'اسلامی ریاست میں اجتہاد کو قانون کا مرتبہ کس طرح حاصل ہوگا؟' آپ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:

''اس سلسلے میں میرے غور وخوض اور فکر و تأمل کا نتیجہ ہے کہ عصر حاضر میں اسلامی ریاست کے لیے ''اجتماعی اجتہاد'' یعنی اجتہاد الجماعۃ ہی قانون کی حیثیت سے قابل قبول ہونا چاہیے کیوں کہ امت مسلمہ میں موجودہ گروہی، مسلکی اور طبقاتی تقسیم کے باعث واقعتاً ''اجتہاد الفرد'' یعنی انفرادی اجتہاد آج ریاستی مؤثر کردار ادا نہیں کرسکتا۔ اجتماعی زندگی میں حالات ومسائل کے تنوعات اور پیچیدگیاں بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس ''اجتہاد'' کو ''ریاستی اجماع'' کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے:

۱۔ ہر اسلامی ریاست اپنے اپنے مخصوص حالات ومقتضیات کے مطابق جداگانہ طور پر اجتہاد کی اجماعی صورت اپنائے۔

۲۔ ہر ریاست ایک ایسا قومی ادارہ تشکیل کرے، جو دو ایوانوں پر مشتمل ہو، ان سے ایک ''شورائے عام'' اور دوسرا ''شورائے خاص'' کہلائے۔

''شورائے خاص'' صرف اکابر علماء وفقہاء اور مختلف عصری علوم وفنون اور معاملات کے ماہرین اور محققین ومتخصصین پر مشتمل ہو۔ ان میں سے بعض تناسب آبادی کے اعتبار سے منتخب کیے جائیں اور بعض معینہ کوٹے کے مطابق نامزد ہوں۔

جب کہ ''شورائے عام'' پورے ملک سے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ان نمائندوں کے انتخاب کے لیے کم از کم معیار تعلیم اور معیار اخلاق مقرر ہو تاکہ وہ قومی نمائندے اہل عدالت اور اہل رائے کی شرط پوری کرسکیں۔

یہ دونوں ایوان باہمی مشاورت سے آئین قوانین ریاست کی تشکیل وتوضیح کے لیے اجتہاد کریں۔

ان کا یہ ''اجتماعی اجتہاد'' بہر صورت

۱۔ قرآن وسنت کا پابند ہو اور اجماع ماسبق کی روشنی میں واقع ہو۔

۲۔ ملک میں رہنے والے مسلمانوں کے اکثریتی فقہی مذہب کے بنیادی ڈھانچے کے مطابق ہو مگر حسب ضرورت دوسرے فقہی مذاہب کو بھی جگہ دی جاسکے۔

۳۔ اگر یہ دو دیوانی مقننہ یا مجلس شوریٰ کی ضرورت محسوس کرے تو اہل علم وفکر کی کسی اور وقیع مجلس مثلاً Islamic Ideology Council یا دیگر ماہرین (Technocrate) وغیرہ سے علمی اور فنی مشورہ طلب کرسکے۔

مذکورہ بالا طریقے پر اہل علم وفکر کی بھرپور مشاورت کے نتیجے میں جو 'اجتماعی اجتہاد' وجود میں آئے گا، اسی کو اسلامی ریاست میں قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔ یہی مجلس شوریٰ اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ (Parliament) یا نیشنل اسمبلی یا سینٹ وغیرہ کہلائے گی۔

میری تحقیق کے مطابق دورِ خلافتِ راشدہ کے اکثر اجتہادات اسی اجماع اور شورائی نوعیت کے تھے۔'' (۱۰)

ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کی تجویز

موجودہ دور میں فقہاء کی اجتہادی کوششوں کو منظم کرنے اور جدید دور کے مشہور مسائل پر ان کے اختلافات کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تجویز بڑی اہمیت رکھتی ہے، جسے انہوں نے تفصیل سے پیش کیا۔ یہاں ان کے الفاظ نقل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''ہر ملک میں انجمن فقہاء قائم کی جائے۔ کسی مقام پر اس کا صدر مرکز ہو۔ یہ مرکز پاکستان بھی ہوسکتا ہے اور پاکستان سے باہر بھی۔ حتیٰ کہ ماسکو اور واشنگٹن میں بھی ہوسکتا ہے، اس میں کوئی امر مانع نہیں کیوں کہ یہ صرف مسلمانوں کا ایک مخصوص ادارہ ہوگا۔ جہاں بھی مرکز ہو اس کو سوال پیش کیا جائے گا۔ اگر سیکرٹریٹ کی رائے میں وہ سوال واقعی اس کا متقاضی ہو۔ مسلمان فقہاء عالم رائے دیں تو اس سوال کو اپنی ساری شاخوں کے پاس روانہ کردے گا، اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی اور غیر اسلامی ممالک کی شاخوں کو بھی۔ ہر شاخ کا سیکرٹری اپنے ملک کے سارے مسلمان قانون دانوں کے پاس سوال کی نقل روانہ کرکے درخواست کرے گا، تم اپنا مدلل جواب اس کے متعلق روانہ کرو، جب اس کے پاس یہ جواب جمع ہوجائیں، تو مرکز کو روانہ کرے گا کہ یہ متفقہ جواب ہے۔ اگر اختلافی جواب ہو تو اختلافات کے ساتھ۔

غرض جب ساری شاخوں کے پاس سے جواب آجائے اور دیکھا جائے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے، تو اس امر کا اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اس جواب پر سب متفق ہیں لیکن اگر اختلاف ہو تو دلیلوں کا ایک خلاصہ تیار کیا جائے اور دوبارہ اس کو گشت کرایا جائے تاکہ جن لوگوں کی پہلے رائے تھی، ان کے سامنے مخالف دلیلیں بھی آئیں اور انہیں غور کرنے کا موقع ملے۔ ممکن ہے وہ اپنی رائے بدل کر اس دوسری رائے پر متفق ہوجائیں، جو ان کے مخالفین کی تھی۔ جب اس طرح کافی غور وخوض کے بعد دوبارہ تمام شاخوں سے مرکز کے پاس جواب موصول ہوجائیں، تو یہ معلوم ہوجائے گا کہ کس چیز پر اجماع ہوا ہے اور کس چیز پر اختلاف رائے ہے۔

نیز یہ کہ اختلافی پہلو پر اکثریت کی رائے کیا ہے؟ ان سب نتائج کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کیا جائے جس میں جوابات مع دلائل درج ہوں۔

یہ میرا تصور ہے کہ ہمارے زمانے میں اجماع کا اگر ہم ایک ادارہ بنانا چاہیں، تو کس طرح بنائیں اور کس طرح اس سے استفادہ کریں۔ یہ قطعاً ممکن نہیں کہ دنیا بھر کے ماہر فقہاء اسلام کو مستقل طور پر ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ وہ کسی چند روزہ اجتماع میں شرکت کے لیے تو آسکتے ہیں لیکن ساری عمر ایک مقام پر گزارنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ان ملکوں کے لیے جہاں کے باشندے ہیں، فائدہ مند چیز ہوگی کیوں کہ ان کی خدمات سے ان کے ہم وطن محروم ہو جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر اس طرح انجمن بنائی جائے، تو وہ اپنی رائے آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں اور ان سے ساری دنیا کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔'' (۱۱)

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی کی تجویز

اس مثالی اجماع (ڈاکٹر حمید اللہ کے تجویز کردہ) کی تنظیم کے ساتھ ساتھ ملکی سطح پر نئے مسائل کے باب میں علماء کی اجتماعی رائے معلوم کرنے اور پھر اسے مشتہر کرنے کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ بات اس وجہ سے اور زیادہ توجہ طلب ہے کہ ہر ملک میں سماجی و معاشی زندگی سے متعلق نئے نئے مسائل ابھرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ایک ملک کے یہ مسائل مقامی مخصوص صورت حال کی پیداوار ہوتے ہیں، جو دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے یا وہاں کے مسائل مختلف ہوتے ہیں۔ عام مسلمان ان کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ انفرادی طور پر فقہاء یا مفتیانِ کرام سے رجوع کرتے ہیں اور بعض دفعہ ایک مسئلے پر دو فقیہوں کے فتوے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور لوگ حیص بیص میں مبتلا رہتے ہیں کہ کس پر عمل کریں۔ اس صورت حال میں بہتر ہوگا کہ ہر ملک کی راج دھانی یا وہاں کے کسی بڑے شہر میں اجماع کی ادارتی تنظیم قائم کی جائے اور فقہاء کا ایک مرکزی بورڈ تشکیل دیا جائے اور تمام صوبوں یا علاقوں کے معروف فقہاء کو اس مرکزی بورڈ سے منسلک کیا جائے۔ درپیش مسائل کے بارے میں ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ خواہ ان کی میٹنگ بلا کر اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعے یا تحریری صورت میں علاحدہ علاحدہ ان کی رائے حاصل کر کے اور ان کے اختلاف کی صورت میں دوبارہ غور و فکر کے لیے وہی طریقہ اپنایا جائے، جس کا ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا تجویز میں ذکر ملتا ہے اور پھر اس مسئلے میں فقہاء کے متفقہ فیصلے یا ان کی اکثریت کی رائے نافذ العمل قرار دے کر عام مسلمانوں کو اس سے باخبر کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس سے فقہی اختلاف بھی کم ہو جائیں گے اور ہر دور میں ابھرنے والے نئے مسائل سے متعلق شریعت کا موقف واضح ہوتا رہے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس طور پر اجتماعی غور و فکر کے نتیجے میں جو فتوے یا فیصلے سامنے آئیں گے، وہ عوام میں قابل قبول ہوں گے۔ اس لیے کہ (جیسا اوپر اشارہ کیا گیا) اجتماعی رائے بہر حال انفرادی رائے کے مقابلے میں زیادہ وزن رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام کوششوں کی بار آوری اس پر منحصر ہے کہ کسی مسئلے پر غور کرتے وقت علماء مسلکی اختلافات، جماعتی تعصّبات اور ذاتی رجحانات سے بلند ہو کر اس رائے پر اتفاق کریں، جو قرآن و سنت سے زیادہ قریب نظر آئے۔ (۱۲)

ہر ملک کی راج دھانی یا وہاں کے کسی بڑے شہر میں اجماع کی ادارتی تنظیم قائم کی جائے اور فقہاء کا ایک مرکزی بورڈ تشکیل دیا جائے اور تمام صوبوں یا علاقوں کے معروف فقہاء کو اس مرکزی بورڈ سے منسلک کیا جائے۔ درپیش مسائل کے بارے میں ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

ختمِ رسالت کا اعجاز

علوم جدید سے پیدا ہونے والے نئے مسائل سے انکار یا صرفِ نظر بھی ممکن نہیں ہے اور نہ کسی نبی کی بعثت کا امکان ہے۔ ایسے میں دین اسلام کی شانِ کمال کے اظہار اور ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ پرانے اصول نئے مستند علماء کی توجہات کا مرکز بنیں اور اخذ و استنباط کی ان وسعتوں کو کام میں لایا جائے، جو ہر غائب و موجود، ہر جدید و قدیم کے خالق، خداوندِ قدوس نے اپنے دینِ متین میں ملحوظ رکھی ہیں کیوں کہ وہ علم ازل میں یقیناً یہ بات جانتا تھا کہ اسے اپنی دنیا کو کہاں سے کہاں تک لے جانا ہے۔ اس لیے اگر ہم مسلمان ہیں، اگر ہم تکمیلِ دین پر ایمان رکھتے ہیں اور اگر ختم نبوت کا عقیدہ ہماری اساس ہے اور الحمد لِلّٰہ ایسا ہی ہے، تو ہمیں یقین کرنا ہوگا کہ ہمارے یہی اصول نہ صرف ضرورتوں بلکہ قیامت تک پیش آسکنے والی تمام ضرورتوں کے لیے ایسے ہی کافی ہیں، جیسے کہ کبھی تھے کیوں کہ گو نزول وحی کا دروازہ بند ہے لیکن اخذ و استنباط کی راہیں کھلی ہیں۔ اب مسلمانوں نے اگر ارشاد ربانی کے مطابق زندگی کی ضروریات کے لیے قرآن کریم اور آنحضورﷺ کے ارشاد سے استفادہ کے طریقے متعین کیے تو اسے قرآن کریم اور ختم رسالت کا اعجاز کہنا چاہیے کہ جو قواعد و ضوابط مقرر کیے گئے ہیں، وہ دنیا کے کسی انقلاب اور زمانے کے کسی تغیر سے بے کار یا بے اثر نہیں ہوئے اور انہی قدیم پیمانوں سے اس نئی دنیا کی پیمائش بھی بآسانی ممکن ہے اور اس قیاس و استنباط و اجماع میں ان تمام مسائل کا حل موجود ہے، جنھیں علوم جدیدہ کا سیل رواں اپنے ساتھ لایا ہے۔

ادیانِ سماوی کا وہ آخری قانون، جسے تمام چیزوں کے جاننے والی ذاتِ حکیم نے دنیا میں آسکنے والے انقلابات و تغیرات کی رعایت اور انسانی ضروریات کا لحاظ کر کے تعلیم فرمایا، اس میں اتنی جامعیت ہے کہ وہ ترقی پسند انسان کی ہر دور میں کامل رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلامی اصول، عام اس سے کہ منصوص ہوں یا مستنبط، ان شآء اللہ بشرطِ غور و فکر و تدبر تمام مسائل کے لیے کافی و وافی ہوں۔ (۱۳)

اجماع بحیثیت ادارہ

اجماع اس دور میں تقریباً ''اجتماعی اجتہاد'' کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ اجماع کو باقاعدہ ایک ادارے کی شکل دینا اس دور میں بے انتہا ضروری ہو گیا ہے۔ قرآن مجید نے جس ''امرھم شوریٰ بینھم'' کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی عملی شکل اجماع کا ادارہ ہے۔ اجماع کے اس ادارے میں پوری امت کی نمائندگی ضروری ہے، بلا شبہ اس دور میں جدید فقہ کی ضرورت ہے، اسے ''انفرادی اجتہاد'' کے ذریعے وجود میں لایا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے ''اجتماعی اجتہاد'' کی ضرورت ہے۔ یہ ''اجتماعی اجتہاد'' اسی وقت ہوسکتا ہے، جب اجماع کو باقاعدہ ادارے کی شکل دے دی جائے۔ (۱۴)

قانونِ اجماع

چونکہ زمانے کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں تغیر رونما ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے نئے پیش آمدہ حالات و مسائل اور ان کے تصفیے کے لیے اسلامی حکومت کے اصحاب علم و تدبیر کی رائے عامہ کا کسی قانونی معاملے میں متحد ہو جانا اجماعِ امت ہے اور اس اتحاد کے بعد اسلامی معاشرے کی پوری رائے عامہ جمع ہو جاتی ہے اور بقول علامہ ابوبکر جصاص ؒ خداوند عالم نے امت مسلمہ کو امتِ وسطیٰ و بہترین امت کا خطاب دیا ہے اور اس کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے حجت قرار دیا ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ امت کا اجماع فی نفسہ حق ہے اور اس امت کا اجماع اصولاً صحیح اور قابل عمل ہے۔ کیوں کہ حضور رسالت مآب ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر اکٹھی نہ ہوگی۔ عہد نبوت سے لے کر قیامت تک صالح اور متدین مسلمانوں کی رائے عامہ کا اجماع تقلید ہے۔ البتہ اجماع کے لیے شرط ہے کہ وہ اساسی قانون کے مطابق ہو، مسلمان جس فیصلے پر مجتمع ہوں، وہ قانونِ الٰہی کے منشا کے خلاف نہ ہو۔ اگر فاسق اور بدکار اشخاص مسلمانوں کی صورت میں مجتمع ہو کر اپنی رائے پر جمع ہو جائیں اور وہ رائے اصولِ دین کے خلاف ہو تو اس کو قانونِ اجماع کا درجہ حاصل نہ ہوگا۔

بقول حضرت علامہ ابوالبقا حنفی امت محمدیہ کے ارباب اجتہاد (راسخ العلم فقہاء و مفکرین و مدبرین) کا قانونی حکم پر جمع ہو جانا اجماع امت ہے۔ اس کو قانونی طور پر حجت سمجھا جاتا ہے۔ قانونِ اجماع کے جو نظائر تواتر اور تسلسل کے ساتھ رہیں، تو ان کو قانون کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (۱۵)

اصل سرچشمہ وحی و نبوت ہے

جمہور مسلمانوں کے نزدیک شریعت کے وہ اصول جن سے اخروی نفع و نقصان یا دنیوی احکام ثابت کیے جاسکیں، وہ صرف چار ہیں:

(۱) قرآن حکیم (۲) سنت رسول ﷺ یعنی حدیث (۳) اجماع (۴) قیاس

ان میں قرآنِ کریم اور سنت رسول ﷺ یعنی حدیث کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے اور یہی در اصل اجماع اور قیاس کے لیے سرچشمہ اور مآ خذ کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ اجماع بھی کسی ایسی بات پر منعقد ہوتا ہے، جو خبر واحد یا قیاس یا کسی اور طریقے پر مفہوم ہو۔ کسی بے بنیاد امر پر اجماع کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ جو جی میں آئے اس پر اجماع منعقد کر لیا جائے۔

شریعت میں اپنی طرف سے کسی چیز کا عقل اضافہ نہیں کرتی، بلکہ وہی بات یعنی نتائج و احکام کا جو روغن وحی و نبوت کے ان معلومات میں چھپا ہوا تھا، عقل کی مشین ان کو ہی اپنی طاقت کی حد تک نچوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔ چنانچہ شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات مکیہ میں ایک مقام پر ارقام فرماتے ہیں:

یہ جاننا چاہیے کہ نئے سرے سے کسی حکم کا پیدا کرنا اجتہاد نہیں ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ شریعت میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے وہ قرآن و سنت سے دلیل تلاش کرنے میں جد و جہد کرنا یا اجماع یا زبانِ عربی کے محاورات کی رہنمائی میں کسی خاص مسئلے میں کسی ایسے حکم کو ثابت کرنا ہے، جو دلیل سے پیدا ہوتا ہو، جس کی تلاش میں تم نے کوشش کی اور اپنے خیال میں اس حکم کا علم اسی دلیل سے تمہیں حاصل ہوا۔ بس اسی کا نام ''الاجتہاد'' ہے یعنی شریعت میں یہی اجتہاد بہتر ہے۔

پھر آگے شیخ اکبر لکھتے ہیں:

کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے۔ پس ''الدین'' کسی زیادتی کو قبول نہیں کرسکتا۔ اگر کہا جائے کہ دین میں اضافے کی گنجائش ہے، تو دین کے نقص کے ہم معنی ہوگا۔ (۱۶)

> ہر ملک میں انجمن فقہاء قائم کی جائے۔ کسی مقام پر اس کا صدر مرکز ہو۔ یہ مرکز پاکستان بھی ہو سکتا ہے اور پاکستان سے باہر بھی۔ حتیٰ کہ ماسکو اور واشنگٹن میں بھی ہو سکتا ہے۔

دین میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ ہمارے لیے وہی معتبر و معیاری شریعت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے نبی کائنات ﷺ کی وساطت سے ہمیں بھیجی۔ اب رہا ''اجماع'' یہ قرآن مجید اور حدیث کے بعد شریعت اسلامیہ کا مأخذ ہے، لہٰذا اس کا بھی شرعی دلیل بننے کی صلاحیت کا انحصار ان دونوں پر ہے یعنی قرآن و سنت پر ہے۔

اصولیین نے اجماع کی حسب ذیل تعریفات مرقوم کی ہیں۔

۱۔ ایک زمانے کے عام فقہاء مجتہدین کے کسی شرعی حکم پر اتفاق کر لینے کو اجماع کہتے ہیں۔

۲۔ بعض اصولیین نے علماء امت، ارباب حل و عقد پھر اہل رائے و اجتہاد کا نام اجماع رکھا ہے۔

۳۔ سیف الدین آمدی اور کچھ دوسرے اصولیین کی رائے میں امتِ مسلمہ کے اتفاق کا نام اجماع ہے۔

۴۔ بعض امورِ شرعیہ میں اجماع کو حجت مانتے ہیں اور امورِ عرفیہ وعقلیہ میں بھی۔

۵۔ محمد شوکانیؒ کی رائے ہے کہ امورِ شرعیہ کی قید درست نہ ہوگی بلکہ اس کی جگہ کسی بھی ''امر'' پر اجماع کرنا ہوگا۔ اب ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ امت کے اہلِ علم وفضل سب کے سب کسی امر پر اتفاق رائے کر لیں جس کیلئے ان کے پاس دلیل شرعی نہ ہو۔ (۱۷)

شوریٰ

اسلامی حکومت میں شوریٰ یا مجلس اہل حل وعقد یعنی حکومت کے مدبروں اور مشیروں کا مرکزی ادارہ جس کے ارکان اپنے اعلیٰ کردار اور بلند خدمات کی وجہ سے امت کے اعتماد کا مرکز ہوتے ہیں، اسلامی حکومت کی جان ہے۔ شوریٰ کے فیصلے قانون اساسی کو پیشِ نظر زمانہ کے تغیر پذیر حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ شوریٰ اسلامی حکومتی دنیا کی تمام جمہوری حکومتوں سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

شوریٰ کی قانونی حیثیت

شوریٰ کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ نہ صرف امت کے لیے بلکہ رسالت مآب ﷺ کو فرمایا گیا، ''وشاورھم فی الامر'' یعنی حکومتی معاملات میں شوریٰ پر عمل کیجیے اور مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق باضابطہ طور پر فرمایا گیا، ان کی حکومت کے کام شوریٰ سے انجام پاتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ اس پر شاہد عادل ہے۔ (۱۸)

تاریخی پس منظر

صحابہ کرامؓ کے تعامل میں بھی اجماع کی نظیر موجود ہیں، جو اجماع کی حجیت کو ثابت کرتی ہیں، مثلاً چند نظیریں حسب ذیل ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اس امت میں سب سے پہلا کام جو صحابہ کرامؓ نے کیا وہ اجماع ہوا یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت پر اجماع۔

۲۔ شراب نوشی کی سزا ۸۰ کوڑے، اجماعِ صحابہ سے طے ہوئی غیر متبدل قانون بن گئی۔

۳۔ کاریگر کو اجماعِ صحابہ سے دی ہوئی چیز کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ اگر وہ تلف ہو جائے تو اسے قیمت ادا کرنی ہوگی۔

۴۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرنے والوں کے خلاف جہاد کرنا اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔

۵۔ مفتوحہ علاقے کی زمین اجماعِ صحابہ ہی سے اوقاف میں شامل کی گئی۔

اسی طرح کی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جو کہ اجماعِ صحابہ کی وجہ سے مستقل قانون بن گئے۔ (۱۹)

حضرت عمرؓ کا خیال

مفسرین کرام کی تحقیقات سے غور وفکر کی نئی راہیں ضرور سامنے آتی ہیں، لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مفسرین کی تفسیر ہے۔ قرآن کا حقیقی مطلب نہیں ہے، جس طرح حالات نے ان کے سامنے نئی راہیں کھولیں، اسی طرح آئندہ زمانے میں

> عصر حاضر میں اسلامی ریاست کے لیے ''اجتماعی اجتہاد'' یعنی اجتهاد الجماعة ہی قانون کی حیثیت سے قابل قبول ہونا چاہیے کیوں کہ امت مسلمہ میں موجودہ گروہی، مسلکی اور طبقاتی تقسیم کے باعث انفرادی اجتہاد موثر کردار ادا نہیں کر سکتا۔

محققین کی نظر دوسرے پہلوؤں پر بھی پڑ سکتی ہے۔ عہدِ صحابہ میں بھی اس کی نظیریں مل جاتی ہیں، مثلاً عراق کی فتوحات کے بعد صحابہ کا اصرار تھا کہ ساری مفتوحہ اراضی مال غنیمت کے اصول پر فوج کے درمیان تقسیم کر دی جائے لیکن حضرت عمرؓ کا خیال تھا کہ اگر ایسا ہوا تو سلطنت چھوٹی چھوٹی زمینداریوں میں بٹ جائے گی، اس کی وجہ سے نہ اجتماعی نظام قائم ہو سکے گا نہ سلطنت کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام ہو پائے گا، لیکن دوسرے صحابہ سابق نظیر کی بنا پر تقسیم پر مصر تھے۔ بالآخر سورۂ حشر کی آیت ﴿والذین جاءوا من بعد هم﴾ نے تقسیم کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ یہ آیت سب کے سامنے تھی۔ لوگ تلاوت بھی کرتے رہتے تھے مگر اس کا خاص پہلو اس سے پہلے کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا مگر جب اس موقع پر پڑھی گئی تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ (۲۰) اس دلیل سے جہاں اجماع کے تاریخی پس منظر پر نظر پڑتی ہے، وہاں اس امر کی بھی دلیل میسر آتی ہے کہ اجماع قرآن وسنت سے ماخوذ دلیل پر ہوا کرتا ہے۔

اجماع کے ناسخ ہونے کی بحث

حنفی اصول فقہ کی معروف کتاب کشف الاسرار، شرح اصول بزدوی میں علامہ عبدالعزیز بخاری لکھتے ہیں:

ہمارے بعض مشائخ کے نزدیک جن میں عیسیٰ بن ابان شامل ہیں، اجماع، کتاب وسنت اور اجماع کا ناسخ ہو سکتا ہے۔ بعض معتزلہ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ انہوں نے اس روایت سے سند لی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے دو بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے ماں کا حصہ تہائی کی بجائے چھٹا کر دیا تو حضرت ابن عباس نے دریافت فرمایا کہ جب قرآن کا حکم ہے کہ کئی بھائی ہوں تو ماں کا حصہ چھٹا ہوگا، تو آپ نے ماں کا حصہ کیسے کم کر دیا، جب کہ دو بھائی کئی بھائی (بھائی کی جمع) نہیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ''اے لڑکے! تیری قوم نے اس کا حصہ کم کر دیا ہے۔'' اس روایت کو اجماع کے ناسخ ہونے کے جواز کی دلیل کہا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں جو اجماع منعقد ہوا، اس کی رو سے صدقات میں مؤلفین قلوب کا حصہ ختم کر دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ اجماع شرع

کے ان دلائل اور حجتوں میں سے ہے، جو کتاب اور سنت کی طرح علم کا وجوب بہم پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ نصوص کی طرح اس سے بھی نسخ جائز ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اجماع مشہور خبر سے زیادہ قوی ہے، جب خبر مشہور سے نسخ جائز ہے، جیسا کہ اس کی بنا پر نص کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو نسخ کی ایک شکل ہے تو اجماع تو اس سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ (۲۱)

اوپر کی مثال اجماع صحابہ کی ہے، مگر جمہور فقہاء کا اس سے اتفاق نہیں اور سارے حنفی فقہاء کی بھی یہ رائے نہیں تھی۔ راقم السطور کا مقصد اس روایت کو بیان کرنے کا یہ ہے کہ اجماع صحابہ ہوا اور اجماع کی تاریخی حیثیت موجود ہے۔ اس سے کسی مسئلے کے اثبات یا نفی کے مقاصد نہیں ہیں، صرف اجماع کی اہمیت واضح کرنا ہے۔

قانون صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

قانون صحابہ مستقل قانون نہیں بلکہ قانونی تفصیلات پر مبنی ہے، جس طرح قانون سنت کا مأخذ قرآنِ حکیم ہے۔ اسی طرح قانونِ صحابہ کا مأخذ کتاب وسنت دونوں ہیں۔ صحابہ کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ وہ اسلام کے اوّلین زمانۂ قانون میں موجود تھے۔ ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے مستند قرار دیا گیا ہے۔ ان کے دل نورِ نبوت سے مستنیر تھے اور حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے اور اپنے صحابہ کے راستے کو ہی راہِ نجات اور صراطِ مستقیم فرمایا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم قانونِ اسلامی کو بخوبی سمجھتے تھے۔ علم صحیح اور عمل صالح سے بہرہ مند تھے، ان میں خلفاء راشدین بھی تھے، عہد نبوی کے گورنر، سپہ سالارانِ افواجِ اسلامی بھی۔ اسی لیے ہم لوگوں سے زیادہ صحابہ کو قرآنی قانون کی تشریح کا حق حاصل ہے۔ بقول ابن قیم: صحابہ اپنے تشخص میں اجتماعی ہیئت کے سردار اور قائد تھے اور صحابہ کے عدل (راست بازی) ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ اسی لیے علامہ ابواسحٰق شاطبی غرناطی نے فرمایا، سنۃ الصحابۃ کسنۃ الرسول (صحابہ کا قانون، قانون سنت کی طرح ہے) کیوں کہ یہ قانونی تفصیلات، تشریحات اور نظائر مہیا کرتا ہے۔ (۲۲)

نوٹ

اجماع صحابہ اور صحابی کی رائے میں فرق ہے۔ صحابی کی رائے انفرادی حیثیت رکھتی ہے اور اجماع صحابہؓ صحابہ کرامؓ کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے۔ جہاں تک انفرادی رائے کا تعلق ہے، وہ مختلف صحابہ کی مختلف ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے۔ ان آراء میں امت کو اختیار ہے کہ وہ کسی بھی رائے کو اختیار کرے، کسی بھی رائے کو چھوڑ دے لیکن اجماعِ صحابہ کو چھوڑا نہیں جا سکتا، کیوں کہ یہ مسلمہ حقیقت بن جاتا ہے۔ (۲۳)

تغیر آیت الٰہی

چونکہ خدا تعالیٰ ہی تمام کائنات اور زندگی کی روحانی بنیاد ہے، اس لیے خدا سے وابستگی درحقیقت انسان کی اپنی بلند ترین خودی سے وابستگی کے مترادف ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کائنات کی یہ بنیادی حقیقت ازلی ہے، جو ہر لمحہ اور ہر آن ایک نئی شان سے ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے، یہ ازلی اور ابدی حقیقت مرورِ زمانہ سے مختلف لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، چنانچہ وہ مثالی ہیئت اجتماعیہ جو اس بنیادی حقیقت پر تعمیر ہوگی، یقیناً اسی طرح پائیداری اور تبدیلی کا مجموعہ ہوگی۔ اس کی اجتماعی زندگی کے روزمرہ کے حالات کو استوار کرنے کے لیے چند پائیدار اساسوں کی ضرورت ہوگی اور اسی سے اس تغیر پذیر ماحول میں اس کو پائیدار ارتقا حاصل ہو سکے گا لیکن اگر یہی اساسی اصول تمدنی زندگی کے تغیرات کی رہنمائی نہ کر سکے، تو اس کا نتیجہ جمود اور تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اسی پائیداری اور تبدیلی کی ہم آہنگی کو ہر زمانے اور ہر دور میں قائم رکھنے کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔

اوپر کی عبارت کے معنی زیادہ واضح کرتے ہوئے اس کی تشریح اس طرح ہے کہ اسلام بحیثیت ایک ثقافتی تحریک کے کائنات کو جامد اور غیر متحرک نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک کائنات تغیر اور حرکت سے عبارت ہے لیکن اس کی اساس روحانی اور ابدی ہے اس ابدیت کا زمانی اور تاریخی اظہار تغیر اور تنوع کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام ثبات اور تغیر کا یکساں لحاظ رکھتا ہے۔ وہ ابدی اصولوں کی رہنمائی میں اجتماعی زندگی کو منظّم کرتا ہے۔ یہ ابدی اصول تغیر کے منافی نہیں کیوں کہ تغیر قرآن حکیم کے لحاظ سے خدا کی آیات میں سے ایک زبردست آیت ہے اور جب ابدیت کے اصولوں کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ تغیر خارج از امکان ہو جائے تو زندگی جامد ہو جاتی ہے۔ اگر یورپ کی ناکامی کی وجہ ابدی اصولوں سے چشم پوشی ہے، تو پچھلی صدیوں میں اسلام کا جمود تغیر سے بے اعتنائی کا مرہونِ منت ہے، لہٰذا اجتہاد سے اصولِ اسلام میں حرکت کا اظہار ہوتا ہے۔ (۲۴) یعنی اجتہاد زندگی کی حرکت وحرارت کا اصول ہے۔

آخری بات

ڈاکٹر خالد مسعود اپنی علمی وتحقیقی اور فکری کتاب **اقبال کا تصورِ اجتہاد** میں عہد حاضر کے علماء کی اجتماعی رائے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اجماع اور اجتہاد کے بارے میں علامہ قبال نے ایک طرح سے دو اجتہادات پیش کیے تھے۔ ایک تو اجتہاد کے انفرادی کے بجائے اجتماعی عمل کا تصور، دوسرے قانون ساز اسمبلیوں سے اجماع اور اجتہاد یا اجتماعی اجتہاد کے اداروں کا کام لینے کی تجویز۔

ان میں پہلی بات تو علماء میں خاصی مقبول ہوئی اور بہت سے علماء کے ہاں اس کی تائید ملتی ہے۔ اگرچہ اس میں براہ راست اقبال کے حوالے سے بات نہیں کی گئی، تاہم پاکستان سے مولانا محمد یوسف بنوری اور بھارت سے مولانا تقی امینی نے بہت زور کے ساتھ انفرادی کی بجائے اجتماعی اجتہاد پر زور دیا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس خیال کو حمایت حاصل ہوئی۔ چنانچہ شیخ ابوزہرہ (الاجتہاد فی الفقہ الاسلامی)، مصطفیٰ احمد الزرقا، (الاجتہاد ومجال التشریع فی الاسلام) اور شیخ عبدالقادر المغربی نے (البینات) میں بہت زور دیا۔ البتہ اس اجتماعی اجتہاد کی شکلیں کیا ہوں

گی، اس پر علامہ اقبال کے خیال کو قبولِ عام حاصل نہ ہو سکا۔ اکثر علماء نے جن میں شیخ ابو زہرہ اور مصطفیٰ زرقا بھی شامل ہیں، علماء کی خصوصی مجالس اور تحقیقاتی اداروں کی تشکیل کی تجاویز دی ہیں، لیکن یہ اختیارات قانون ساز اسمبلیوں کو دینے کی تائید علماء کی جانب سے ابھی تک نہیں ہوئی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اگرچہ قانون ساز اسمبلی میں واضح اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس لحاظ سے علامہ اقبال کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانا ممکن تھا کہ اسمبلی کو اجماع و اجتہاد کا ادارہ بنالیا جائے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے پہلے پہل علماء کا خصوصی بورڈ قائم ہوا، جو قانون ساز اسمبلی کی کارروائی کی نگرانی و رہنمائی کر سکے۔ تحقیقی ادارے مثلاً تحقیقاتِ اسلامی وغیرہ قائم ہوئے۔ علماء کی مجالس ''اسلامی مشاورتی کونسل'' اور ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے نام سے آئینی تحفظات کے ساتھ قائم ہوئیں لیکن چونکہ قانون ساز اسمبلی کا باقاعدہ حصہ نہیں تھیں، اس لیے علامہ اقبال کی تجویز عمل میں نہیں لائی جا سکی اور وہ طریقہ جسے وہ سنی ملکوں کے لیے خطرناک سمجھتے تھے، وہ اکثر اسلامی ممالک میں رائج چلا آ رہا ہے۔

راقم السطور کو یہ امید ہے کہ مسلمان مفکرین اور علماء کی تحقیقات کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ پیش آمدہ مسائل کا حل اجتماعی انداز سے تلاش کرے گی۔

○ طارق مجاہد جہلمی برطانیہ میں مقیم ایک محقق ہیں۔
8-Dalby Ave, Bradford BD3-7LW, UK

حوالہ جات

۱- ڈاکٹر خالد مسعود، اقبال کا تصورِ اجتہاد، مطبوعہ مطبوعات حرمت راولپنڈی ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲۔ ڈاکٹر ساجد الرحمٰن صدیقی، کشاف اصطلاحاتِ قانونِ اسلامی، جلد اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۶

۲ برہان احمد فاروقی، سوال و جواب، بحوالہ: منہاج، اجتہاد نمبر، مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری ٹرسٹ، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۲، ۲۵۳۔

۳- ڈاکٹر محمد اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، اردو ترجمہ، سید نذیر نیازی، بزمِ اقبال، لاہور ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۸۔

۴- ایضاً ص ۲۷۰، ۲۷۱

۵- مرزا محمد منور، 'اقبال اور اجتہاد' بحوالہ: منہاج، اجتہاد نمبر، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۴۸۔

۶- شیخ عبدالقادر مغربی، البینات فی الدین والاجتماع والادب والتاریخ، جلد اوّل، ص ۹۸، بحوالہ ڈاکٹر خالد مسعود، اقبال کا تصورِ اجتہاد، ص ۸۷۔

۷- ابوالعرفان ندوی، فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید، ضرورت و اہمیت اور لائحہ عمل، بحوالہ فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، ص ۸۷۔

۸- منہاج، نفاذ شریعت نمبر، مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۴۲۲۔

۹- منہاج، اجتہاد نمبر مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۲۸۵، ۲۸۶۔

۱۰- منہاج، اجتہاد نمبر مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۱، ۳۰۲۔

۱۱- فکر و نظر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ نمبر، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۲۰۰۳ء ص ۱۸۹، ۱۹۰

۱۲- ایضاً ص ۱۹۰، ۱۹۱۔

۱۳- ریاست علی بجنوری، ''فقہ حنفی میں فہم معانی کے اصول''، بحوالہ فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور، ص: ۱۲۸۔۱۲۹۔

۱۴- انور علی سوزاء، نوراسخ العقیدگی اور فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید، بحوالہ فکر اسلامی کی تشکیلِ نو، لاہور، ص: ۷۹۔

۱۵- مولوی محبوب علی، تشریح و تفہیم مسائل مندرجات کتاب ہدایت المسلمین، مطبوعہ نظامتِ اوقاف، مظفر آباد، آزاد کشمیر ۱۹۸۰ء، ص ۳۱۸۔

۱۶- مناظر احسن گیلانی، مقدمہ تدوینِ فقہ، مکتبہ رشیدیہ، لاہور ۱۹۷۶ء، ص: ۳۲، ۳۳

۱۷- محمد اقبال انصاری، 'اجماعِ شریعت اسلامی کا تیسرا ماخذ'، بحوالہ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور ص ۱۵۰۔

۱۸- مولوی محبوب علی، تشریح و تفہیم مسائل مندرجات کتاب ہدایت المسلمین، ص: ۳۱۹۔

۱۹- سید عطاء اللہ حسینی، اسلامی نظام ایک مطالعہ، مطبوعہ گردیزی پبلشر، کراچی ۱۳۹۹ھ، ص: ۳۶۰۔

۲۰- عبدالسلام قدوائی، 'اسلامی شریعت اور وقت کے تقاضے'، بحوالہ فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص: ۲۵۹۔

۲۱- بحوالہ اقبال کا نظریہ اجتہاد، ڈاکٹر خالد مسعود، ص: ۱۹۲، ۱۹۳۔ تفصیلات کے لیے مذکورہ کتاب کا مطالعہ کریں۔

۲۲- مولوی محبوب علی، تشریح و تفہیم مسائل مندرجات کتاب ہدایت المسلمین، ص: ۲۱۸۔

۲۳- عطاء اللہ حسینی، اسلامی نظام ایک مطالعہ، ص ۳۶۱۔

۲۴- بشیر احمد ڈار، فکر اقبال۔ مسئلہ اجتہاد، بحوالہ: مطالعۂ اقبال، مرتب گوہر نوشاہی، بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۸۵۔

سید وحید الدین، 'اسلامی فکر کی تشکیل نو'، اکابر کی نظر میں، بحوالہ: فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور، ص ۲۶۱۔

۲۵- ڈاکٹر مسعود خالد، اقبال کا تصورِ اجتہاد، ص: ۲۳۴، ۲۳۵۔